Research Journal
Tahqeeqat
تحقیقات ریسرچ جرنل
eISSN: 2791-0342
pISSN: 2791-0334

ڈِسٹی نیشن مین ہول میں فرد اور جدید زندگی کے مابین کشمکش کی عکّاسی

The Depiction of Conflict between the Individual and the Modern Life in Destination Manhole

Babar Rehman Shah
PhD Urdu Scholar, University of Sargodha
Dr. Shahid Nawaz
Associate Professor, University of Sargodha

بابر رحمان شاہ
پی ایچ۔ڈی اردو اسکالر، یونیورسٹی آف سرگودھا
ڈاکٹر شاہد نواز
ایسوسی ایٹ پروفیسر، یونیورسٹی آف سرگودھا

Abstract

Modernism is considered to be the extreme height of tension between the individual and the modern life, as the changing values of the scientifically and technologically advanced modern life have evolved a society full of superfluous trivialities, and as a result, an ever widening generation gap has become the new reality of the modern life, where the older generation is lamenting over the loss of their political and moral ideals, while the younger generation is disillusioned from their future and are spiritually wounded. To make matters worse, this split persona of the individual finds himself unequivocally bound to bore the brunt of all the inhumane rules and regulations of the modern life. All of these intensities add up to make the situation utterly hypertense and almost unbearable. This article will ponder this depicted tension between the individual and the modern life and the resulting generation gap in light of Dr. Faheem Azmi's (1935-2004) Urdu novel Destination Manhole (1989).

Keywords*: Modernism, Second Industrial Revolution, Scientific and Technological Advancement, Social Change, Generation Gap, Dr. Faheem Azmi, Urdu Novel, Destination Manhole*

کلیدی الفاظ: جدیدیت، دوسرا صنعتی انقلاب، سائنسی و تکنیکی ترقّی، سماجی تبدیلی، نسلی بُعد، ڈاکٹر فہیم اعظمی، اُردو ناول، ڈِسٹی نیشن مین ہول

تعارف موضوع

مغرب میں جدیدیت کی ادبی تحریک کا آغاز دوسرے صنعتی انقلاب(1870) کے نتیجے میں ہُوا، یہ تحریک سائنس پرستانہ اور معروض پرور رویّوں کے مقابلے میں فرد کی موضوعیت کو اہمیت دینے سے عبارت تھی۔ انفرادیت پر اِس تخصیصی اصرار کی بنیادی وجہ ہی یہ تھی کہ سائنسی و تکنیکی ترقّی نے جس طرزِ زیست کو فروغ دِیا تھا، اُس کے زیرِ اثر فرد اپنی زندگی کو ایک میکانکی ڈھب پر گزارنے پہ مجبور کر دِیا گیا تھا۔ بالکل ایسی ہی صورتِ حال پہلے صنعتی انقلاب(1860) کے نتیجے میں سامنے آئی تھی، اور تب ردِّ عمل کے طور پر رومانی تحریک ظہور پذیر ہوئی تھی۔ اگرچہ پہلے صنعتی انقلاب کے نتیجے میں بھی مغربی طرزِ زیست کا رنگ ڈھنگ کافی حد تک متاثر ہُوا تھا، تاہم دوسرے صنعتی انقلاب کے دوران میں اِس بڑے پیمانے پر سائنسی و تکنیکی ترقّی عمل میں آئی کہ مغربی طرزِ زیست کی سمت و رفتار یکسر تبدیل ہو کر رہ گئی اور طرزِ معاشرت کے حوالے سے انقلابی تغیّرات دیکھنے کو مِلے۔ یکایک ظاہری مظاہر کو حد درجہ اہمیت حاصل ہو گئی، اور فطری طور پر فرد کی باطنی کیفیات، محسوسات اور جذبات کو نظر انداز کرنے کی روش جڑ پکڑ گئی۔ چناں چہ انیسویں صدی کے نصفِ ثانی میں فرد اجنبیت، بیگانگیت اور بیزاری کا شکار ہو کر طرح طرح کے نفسیاتی عوارض کا شکار ہوتا چلا گیا۔ فرد کی داخلیت کے حوالے سے اِن مسائل و مباحث کو جدیدیت کی تحریک نے اپنا موضوع بنایا، یہی وجہ ہے کہ جدید فن پاروں میں فرد اور جدید طرزِ زیست کی باہمی آویزش کو ایک مستقل اور اہم موضوع کا درجہ حاصل ہے۔

سائنسی ترقّی کے حوالے سے جدید فکر کے حامل مفکرین میں گہری تشویش پائی جاتی ہے۔ سائنسی ترقّی نے جہاں زندگی کو آسان بنانے کی خاطر نت نئی سہولیات فراہم کیں، وہیں صدیوں سے رائج اقداری نظام کو بھی منہدم کر دِیا، جس کے باعث انسانوں کے باہمی تعلّقات انتہائی بری طرح متاثر

ہوئے۔ سائنسی ترقّی اور اقداری نظام میں بتدریج بڑھتی خلیق کو جدیدیت کی تحریک نے پوری شد و مد کے ساتھ موضوع بنایا ہے، اِس ضمن میں قاضی جاوید لکھتے ہیں:

> "سائنس پرستی کے زرّیں دور ہی میں سائنس کے رائج الوقت میکانکی منہاج کے داخلی تضادات اُجاگر ہونے لگے تھے اور بالآخر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ یہ منہاج اپنی ماہیت کے اعتبار سے ہمارے حیاتی و قدرتی مسائل حل کرنے کے نااہل ہے۔ سائنس کی یہ ناکامی کوئی معمولی حادثہ نہ تھا۔ کیوں کہ اُس زمانے میں سائنس علما کے حلقے تک محدود نہ تھی، بل کہ اِسے ایک مقبولِ عام عقیدہ و مذہب کا درجہ حاصل ہو چکا تھا، اور اِس سے بہت سی جذباتی اُمّیدیں وابستہ کر لی گئی تھیں۔ یوں سائنس کے بحران سے ایک عظیم ذہنی و جذباتی خلا پیدا ہو گیا، جسے پُر کرنے کے لیے دو فلسفیانہ تحریکیں منظرِ عام پر آئیں۔ اِن میں سے ایک منطقی ایجابیت ہے جس کا تعلّق ذہنی پہلو سے ہے۔ اِس تحریک کے علم بردار ابتدا ہی سے اِس بات کو تسلیم کر لیتے ہیں کہ اُن کا دائرۂ کار سائنسی منہاج اور زبان کے مغالطوں سے پیدا شدہ مسائل کا حل کرنے تک محدود ہے۔ وہ وجود و اقدار کے مسائل حل کرنے کے مدّعی نہیں۔ یہ فرض دوسری فلسفیانہ تحریک نے سر انجام دِیا۔ جسے وجودیت کا نام دِیا جاتا ہے۔ یہ دونوں جدید فکری تحریکیں روایتی فلسفے کی دور از کار تجریدیت و تصنع کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے فلسفے کو زمین پر واپس لانے کی خواہش مند ہیں۔"(1)

جدیدیت پسندوں کو لاحق تشویش کی بڑی وجہ یہ تھی کہ سائنسی ترقّی نے سماجی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلیاں لانا شروع کر دی تھیں۔ سائنس کا مطمحِ نظر بھی یوں تو انسان دوستانہ ہی تھا، تاہم سائنسی فکر میں روحانی اور مابعد الطبیعیاتی عناصر کی مطلق گنجائش نہیں ہے۔ انسانی فطرت کی ماورائیت سے دلچسپی کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ جادوگری اور مذاہب کی تواریخ اِس امر کا بیّن ثبوت ہیں کہ انسان ہمیشہ سے ایسی تصوّرات میں دلچسپی لیتا رہا ہے، جن کو ممکن الوجود بنانا اُس کی اپنی صلاحیت کے بس کی بات نہ ہو۔ مذاہب کی تاریخ اِس بات کی شاہد ہے کہ انسان دائمی فنا سے بچنے کے لیے بعد از ممات کسی جاذبِ نظر متبادل کا خواہش مند ہے۔ بھلے ہی یہ ایک طفل تسلّی ہو اور انسان یہ سب کتھائیں اپنے ذاتی تسکین کی خاطر ہی کیوں نہ گھڑ تا آیا ہو، تاہم اِس امر سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعد از ممات متبادلات سے انسان کی ڈھارس سی بندھی رہتی ہے اور وہ زندگی کی تلخیوں کو ہنس کر گوارا کیے رہتا ہے۔ البتہ ڈارونیت کے تحت اصل الانواع کی سائنسی تھیوری نے اساطیر اور مذاہب کے طلسم کو ایک کاری ضرب لگائی، جس کے باعث انسانی عقائد کو تاریخ کا سب سے بڑا جھٹکا لگا۔ مزید یہ کہ سائنسی ترقّی کے باعث رونما ہونے والے صنعتی انقلابات کے تحت پنپنے والی مادّیت پرستی نے معاشرتی اقدار کے نظام کو کھوکھلا کرنے کے ساتھ ساتھ ایک میکانیکی اور مشینی طرزِ زیست کو بھی فروغ دِیا اور آخر الامر، سائنسی ترقّی کے نتیجے میں ایجاد کردہ جدید اسلحہ اور ایٹمی و کیمیائی ہتھیاروں نے سائنس کی "بشر پسندی" کی قلعی کھول دی۔ سائنسی بیانیے میں در آنے والی اِس محالیت کو وجودی مفکرین نے محسوس کرتے ہوئے اپنی تمام تر توجّہ انسانی وجود کی اہمیت کو اُجاگر کرنے میں صرف کر دی، اور یوں عرفانِ کائنات سے عرفانِ ذات کے استخراجی عمل کا آغاز ہو گیا۔ وجودی فن پاروں میں جدید زندگی کے تناظر میں فرد اور سماج کے مابین اِس کش مکش کو بھرپور انداز سے زیرِ بحث لایا گیا ہے۔

ڈاکٹر سیّد باقر رضوی المعروف فہیم اعظمی (1935-2004) کی شخصیت اُردو فکشن کے حوالے سے کسی تعارف کے محتاج نہیں ہے۔ اُن کے تصنیف کردہ ناولوں میں بہت دیر ہو چکی (1960)، جنم کُنڈلی (1983) اور ڈِسٹی نیشن مین ہول (1989) شامل ہیں۔ فہیم اعظمی اگرچہ دیگر ادبی حیثیتوں کے حوالے سے بھی شہرت یافتہ ہیں، اُن کی تنقید نگاری، ادارتی سرگرمیاں (بحوالہ ماہ نامہ صریر، کراچی) اور شاعری بھی اہمیت کی حامل

ہیں، تاہم اُن کی فکشن (ناول نگاری اور افسانہ نگاری) ہی حقیقی معنوں میں اُن کی وجہِ شہرت قرار دی جاسکتی ہے۔ جدید اُردو فکشن کے تناظر میں فہیم اعظمی کی افسانوی نگارشات کو ایک خاص مقام حاصل ہے، اُنھوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں جدیدیت کی تحریک کے ذیلی رجحانات علامت نگاری، تجریدیت اور سرّیئل ازم کو بروئے کار لانے کے ساتھ ساتھ ہیئتی تجربیت کے مرقّعے بھی پیش کیا ہیں۔ اُن کے یہاں در آنے جدیدیت سے منسلک رجحانات و میلانات محض کورانہ تقلید کا نتیجہ نہیں تھے، بل کہ زمینی حقائق اور عصری حسّیت سے ہم آہنگی کا بیّن ثبوت پیش کرتے تھے۔ فہیم اعظمی کے یہاں جدید فکری رویّوں کے عمل دخل کی نوعیت کو واضح کرتے ہوئے جمال نقوی لکھتے ہیں:

"فہیم اعظمی ایک صاحبِ علم اور باخبر تخلیق کار تھے۔ فلسفہ، تاریخ، قانون، سیاست اور عمرانیات کے عالم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جدیدیت کا شعور صرف ایک فیشن یا دوسروں کی تخلیقات پڑھ کر اُنھوں نے قبول نہیں کیا تھا بل کہ عہدِ حاضر کے جدید معاشروں کی سماجیات اور رائدینِ جدیدیت کے عمیق مطالعے نے اُن کی فکر میں تبدیلی پیدا کی تھی۔ اِسی لیے اُن کی آرا، ان کے افسانوں اور ناول میں اِن علوم کی بھرپور عکّاسی نظر آتی ہے۔[2]

فہیم اعظمی کے یہاں جدیدیت ایک توانا تخلیقی رویّے کے طور پر سامنے آتی ہے۔ اِس جدیدیت کی بنیادیں برِّصغیر ہی کی تہذیبی و ثقافتی جڑوں میں پیوست ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے فکشن پاروں میں مغربی حوالوں کی بھرمار ہونے کے باوجود نفسِ مضمون کی سطح پر مغائرت ہی پیدا ہوتی ہے نہ تصنّع کا شائبہ ہوتا ہے، بل کہ اُن کی نگارشات میں جدید افکار کا انجذاب اور عمل دخل ایک فطری مظہر کے طور پر سامنے آتا ہے، اِس ضمن میں پروفیسر عتیق احمد لکھتے ہیں:

"اُن [فہیم اعظمی] کے یہاں جدیدیت ایسا "فلسفہ" بن کر نہیں آتی جو لکھنے اور پڑھنے والے پر ایک عذاب کے نزول اور مسلّط ہو جانے کا احساس پیدا کرے۔ یہ جدیدیت ہمارے اپنے عہد اور گھر کے آنگین کی مٹّی سے پیدا ہونے والی دوسری نباتات کی طرح کی کیفیت کا پتہ دیتی ہے۔[3]

فی الوقت فہیم اعظمی کا ناول ڈِسٹی نیشن مین ہول زیرِ بحث لایا جارہا ہے۔ اُن کا یہ ناول فرد اور جدید زندگی کے مابین اِس کش مکش کو نشان زد کرتا ہے کہ جدید طرزِ زیست میں انسان کی حتمی منزل آخر الامر گٹر میں گر جانا ہے، جو کہ انسانی وقار کی تنزّلی اور وجود کی تذلیل کے ضمن میں قبر سے پیش تر ہی ایک قعرِ مذلّت ہے۔ ڈِسٹی نیشن مین ہول کے موضوعی دائرۂ کار کی توضیح و تعبیر کرتے ہوئے شفیق الرحمٰن لکھتے ہیں:

"ڈِسٹی نیشن مین ہول (1989) فہیم اعظمی کا دوسرا ناول ہے۔ اُن کا پہلا ناول جنم کنڈلی اپنی ساخت اور فلسفے میں تجرید کا عکّاس ہے اور پیچیدہ اور گنجلک علامتی نظام سے مملو ہے جس کے باعث ابلاغ بھی نسبتاً محدود ہے تاہم یہ ناول بظاہر سادہ تاہم تہ دار بیانیے کی عمدہ مثال ہے جس کی فضا اساطیر اور قدیم ہندی اور یونانی روایات سے اخذ کی گئی ہیں۔ بنیادی طور پر یہ دو کرداری ناول ہے تاہم دونوں کردار صابر اور شاکر ایک ہی کردار کی کیفیاتی توضیح، جذبے اور منطق کا ملاپ ہیں یا نفسیات کی زبان میں ایک دوسرے کا آلٹر ایگو (Alter ego) ہیں۔ اِس ناول میں بھی فلسفۂ تجریدیت ہی ہے تاہم اِس فلسفے تک رسائی حاصل کرنے کے لیے دونوں کردار کئی بار مختلف وجودی بحرانوں سے گزرتے دِکھائی دیتے ہیں۔[4]

ڈِسٹی نیشن مین ہول کے دونوں مرکزی کردار باپ بیٹا؛ صابر اور شاکر؛ ہیں، دونوں کا باقاعدہ کوئی ٹھکانہ نہیں ہے، بل کہ ایک کیرَوَن (Caravan Car) میں ہی رہتے ہیں، جسے کہ ایک پہیوں والا گھر قرار دِیا جاسکتا ہے۔ دونوں اگرچہ ہر وقت ساتھ رہتے ہیں لیکن دونوں کی سوچ میں اپنی اپنی نسل کے میلانات موجزن نظر آتے ہیں، اِس نسلی بُعد (Generation Gap) کو ذہن نشین کرنا ہی اِن دونوں کرداروں کے ناولاتی تفاعل کو

سمجھنے کے ضمن میں ناگزیر ہو جاتا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ نسلی بُعد ہی اِس ناول کے مندرجات کو احاطۂ تفہیم میں لانے کی کلید ہے۔ درحقیقت فہیم اعظمی نے نسلی بُعد کے پردے میں جدید زندگی کے برق رفتاری سے تبدیل ہوتے ہوئے اقداری نظام کی قلعی کھول دی ہے اور اِس جدید طرزِ معاشرت میں فرد کو لاحق لامتناہی تشویش کو نشان زد کر دِیا ہے۔ البتہ یہاں پر ضروری ہے کہ ایک نظر نسلی بُعد کے تصوّر پر بھی ڈال لی جائے، نسلی بُعد کی وضاحت کرتے ہوئے جیرہارڈ فاک اور ارسلا فاک لکھتے ہیں:

> "The phrase "generation gap" implies a deep chasm which opens up between parents and children, between the old and the young, and which is somehow insurmountable."(5)

مذکورہ بالا بیان جہاں دو نسلوں کے مابین ایک خلیج کے حائل ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے، وہیں یہ بیان اِس پہلو کی نشان دہی بھی کرتا ہے کہ یہ خلیج پاٹنا بالفعل ناممکنات میں شامل ہے۔ مادّیت پرستی کی ریل پیل اور روزافزوں اخلاقی دیوالیہ پن کی صورت میں ماضی کی معاشرتی اقدار کا ابطال یقینی ہو گیا ہے، ایسی صورتِ حال میں بزرگ نسل ماضی پرستی (Nostalgia) کا شکار نظر آتی ہے، اور اپنی مثالیت پسندی اور ارفع اخلاقی معیارات کا حامل ہونے کے باعث جدید طرزِ معاشرت سے خائف نظر آ رہی ہے، جب کہ نوجوان نسل جہاں ماضی کے رسوم و رواج کو اپنے راستے کی دیوار سمجھ کر اِن سے بے حسی برتنے کی مرتکب ہو رہی ہے، وہیں اُنھیں عصری بے یقینی کے تناظر میں اپنے مستقبل کے حوالے سے بھی خاصی تشویش لاحق ہے، ڈِسٹی نیشن مین ہول میں بھی صابر اور شاکر اپنی اپنی نسلوں کے نمائندے بن کر سامنے آتے ہیں:

> "اپنے بیٹے کے سامنے اپنی لاعلمی کا اظہار کرنا بھی مشکل تھا۔ کیوں کہ اُس کی فرسودہ سوچ کے مطابق باپ بیٹے کا آئیڈیل ہوتا ہے۔ اُسے نہیں معلوم تھا کہ یہ کنسپٹ کب کا بدل چکا اور؛ زندہ باد ایڈیپس اور فرائڈ؛ بیٹا کرائسٹ ہوتا ہے اور باپ اینٹی کرائسٹ۔ اور "دوسری آمد" میں اینٹی کرائسٹ کو زیر کرنے کے بجائے خود ہی اُس کا روپ دھار لیتا ہے۔ اُس نے اِس نئی تھیوری کے بارے میں پڑھا ضرور تھا مگر ابھی اِس پر یقین نہیں کرتا ہے۔(6)

دوراصل تبدیل شدہ طرزِ معاشرت نے جس حسّیت کو جنم دِیا تھا، اُس کے تقاضے بھی الگ تھے اور اقدار بھی یکسر مختلف تھیں، اور یہی وہ خلیج تھی جو بزرگ نسل کے معیارات اور نوجوان نسل کی امنگوں کے مابین حدِّ فاصل قائم کرنے کا باعث بن رہی تھی۔ اِس ناول کے عمل میں صابر اور شاکر کے مابین یہ نسلی بُعد کہانی کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے:

> [صابر:] یہ تمھارا قصور نہیں ہے۔ یہ نئی جنریشن کے تخصّص (Specialization) کا قصور ہے۔ تم اپنے علمی دائرے کے باہر کچھ نہیں جانتے۔ ہمارے دور میں لوگوں میں عمومیت زیادہ تھی۔
>
> [شاکر:] جی ہاں۔ یعنی میڈیاکریٹی (Mediocrity)، کیا ہے وہ کلیشے جیک آف آل۔(7)

دونوں اپنی اپنی نسل کی اقدار کے امین ہیں۔ صابر روایتی ذہنیت کا مالک ہے، اور بنیاد پرستی اُس کے خون میں دوڑ رہی ہے۔ جب کہ شاکر کی رگوں میں اجتہاد کا لہو ٹھاٹھیں مار رہا ہے:

> [صابر:] سڑکیں بدل گئیں۔ آدمی بدل گئے۔ دوکانیں بدل گئیں۔ کپڑے بدل گئے۔ بولی بدل گئی...
>
> [شاکر:] لیکن آپ اور آپ کی سوکالڈ (So-called) روایت نہیں بدلی۔(8)

ہوتا بھی یہی ہے کہ پُرانی نسل جن اقدار و روایات کو حرزِ جاں بناتی ہے، نئی نسل اُن اقدار اور روایت کو اپنے گلے کا طوق سمجھتی ہے۔ یہی معاملہ صابر اور شاکر کے مابین بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ دونوں کے مابین زندگی کی بدلتی اقدار کی خلیج حائل ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اگرچہ وہ سفر تھے،

تاہم اُن کی فکری راہیں جدا جدا تھیں:

"شاکر گاڑی چلا رہا تھا اور صابر سڑک دیکھ رہا تھا لیکن شعوری طور پر دونوں اپنے آپ سے الگ ہو گئے تھے۔ اسٹیرنگ اور سڑک کے بائیں جانب رہنے کا شعور شاکر کے لیے اور سڑک کو غیر فعالی طور پر دیکھتے رہنے کا شعور صابر کے لیے محض ریفلکس کے تحت اپنا کام انجام دے رہا تھا۔ ورنہ صابر ماضی میں اور شاکر مستقبل میں کھو چکے تھے۔ دونوں فکر مند تھے۔ ایک قدروں سے پیچھا چھڑانے کے لیے اور دوسرا اپنی ممکنات تلاش کرنے کے لیے۔[9]

دراصل صابر کی اقدار پسندی جدید دور کے زیرِ سایہ پنپنے والے زندگی کے منافی ہے، جس کے باعث وہ ہیجان میں مبتلا نظر آتا ہے۔ جدید زندگی کی کھوکھلی اقدار کو اُس کی روایتی ذہنیت قبول کرنے گریزاں نظر آتی ہے۔ اور یوں قدیم اور جدید روایات کی یہ کش مکش باقاعدہ ایک کش مکش اور تنازعے کا روپ دھارنے لگتی ہے:

"گاڑی پھنس گئی"

سب نے ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

"دھکّا دے دیتے ہیں"

"بڑی مہربانی ہے۔"

یہ کہہ کر صابر گاڑی کی طرف جانے لگا تاکہ شاکر سے کہے کہ گاڑی کو گیر میں ڈال کر کلچ کو دبائے۔ لیکن فوراً ہی اُن چاروں نوجوانوں میں سے ایک نے آواز دی۔

"بابو جی۔ پیسے پہلے۔ دس روپے۔"

صابر نے تعجّب سے اُنھیں دیکھا۔ خدا معلوم کیا کیا خیالات اُس کے دل میں آنے لگے۔ انسانیت کا خیال۔ لوگوں کی مدد کرنے کا خیال۔ آسمانی کتابوں کا خیال۔ مکارم الاخلاق کا خیال۔ کنونٹ اسکولوں کی کیرکٹر بلڈنگ کا خیال۔ اور ایسا لگا کہ یہ سب ایک لائن میں کھڑے ہو کر اُس کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ اُس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ شاکر نے کھڑکی سے سر نکال کر زور دے قہقہہ لگایا۔

"دے دیجیے۔ اور کوئی چارہ نہیں۔"

صابر نے دس روپے نکال کر اور ہاتھ کو جھٹک کر اُنھیں اِس طرح دِیے جیسے تمام انسانی اقدار کو دور پھینک رہا ہو۔[10]

مذکورہ بالا اقتباس سے جہاں جدید زندگی کی کھوکھلی اقدار پر روشنی پڑتی ہے، وہیں سوچنے اور سمجھنے کے طریقِ کار میں نسل کا فرق بھی واضح ہوتا ہے۔ صابر کے لیے نوجوانوں کے گاڑی کو دھکّا لگانے کے لیے اُجرت کا طلب کرنا ناقابلِ قبول صورتِ حال ہے، جب کہ شاکر اِسے ایک معمول کے واقعے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ یہ فرق دونوں کے تصوّرِ کائنات (Worldview) میں بھی دیکھا جا سکتا ہے:

[صابر:] "ہماری پہچان ہمارے عقیدے، ہمارے طریقے، ہمارے نظام سے ہوتی ہے اور وہی ہمارے قومیت کی نشانی بن جاتی ہے۔"

[شاکر:] "اور حدود سے؟"

[صابر:] "ہاں اب حدود بھی قومیت کی پہچان ہیں۔"

[شاکر:] "بھی نہیں۔ یہی سیاسی اور ارضی حدود ہماری قومیت کی پہچان ہے اور کچھ نہیں ... اور یہی ہماری قدیم کلچرل سوسائٹی میں نہیں تھا۔"(11)

اور یہی وجہ ہے کہ جہاں شاکر مستقبل کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے، وہیں صابر ماضی میں غلطاں و پیچاں نظر آتا ہے۔

ناول کے معتدبّہ ابتدائی حصّے میں نسلوں کے اِسی فرق کی توضیح کی گئی ہے، تاہم کہانی میں سنسنی اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب صابر اور شاکر کے گاڑی کے پاس دو نوجوان لڑکیاں پریشان حالت میں آتی ہیں، اور "قینچی والے" سے بچاؤ کی خاطر پناہ طلب کرتی ہیں۔ اُن لڑکیوں میں سے ایک کا نام سیما ہے۔ صابر اور شاکر اُنھیں گھر تک چھوڑنے جاتے ہیں۔ بعد ازاں شاکر، سیما کے التفات کو خواہاں ہو جاتا ہے، اور دونوں باپ بیٹا سیما کو بارِ دگر تلاش کرنے نکل پڑتے ہیں۔ مگر اب کی بار شہر کی حالت ابتر ہوتی ہے، تمام شہر قدغنوں کے سائے میں ہوتا ہے، یہاں آزادی کی اہمیت کو اُجاگر کیا گیا ہے:

"بغیر آزادی کے زندگی تو ہوتی نہیں۔ بندش اور موت میں کیا فرق ہے۔ آدمی جینا تو اُسی وقت شروع کرتا ہے جب وہ بندشوں سے آزاد ہونے کو سوچتا ہے۔ بندشیں بے شک اُسے نہ چھوڑیں۔ لیکن آزادی کی سوچ ہی اُس کے وجود کی گواہی ہے۔ چاہے وہ آزادی انکار ہی کی آزادی کیوں نہ ہو۔(12)

اِس ناول میں آزادیِ اظہار پر رائج قدغنوں کی تمام اشکال کی مذمّت کی گئی ہے۔ سیما کی تلاش میں جب صابر اور شاکر شہر کی خاک چھان رہے ہوتے ہیں تو ایک کافی ہاؤس میں اُن کی ملاقات اُفقی صاحب سے ہوتی ہے، جو کہ کیفے کے روح رواں ہیں۔ یہ کیفے فنونِ لطیفہ سے وابستہ شخصیات کی آماج گاہ ہوتا ہے۔ تاہم اِن شخصیات کے نظریات حد درجہ مضحکہ خیز اور دقیانوس ہوتے ہیں۔ اُفقی صاحب، صابر اور شاکر سے اِن شخصیات کا تعارف کرواتے ہیں۔ دراصل مجلسی اور صحافیانہ تنقید کی نوعیت ایسی ہی ہوتی ہے جیسی کہ فہیم اعظمی نے اِس ناول میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

سیما ہی کی تلاش کے دوران میں صابر اور شاکر کی ملاقات ڈائری والے آدمی سے ہوتی ہے۔ جو کہ انسانوں کو مشینوں کی طرح فعال دیکھنے کا قائل ہوتا ہے، ڈائری والے آدمی کے نزدیک ہر شخص کے ایک مخصوص دائرۂ کار متعیّن ہونا چاہیے اور وہ شخص محض اُسی مدار ہی کے گرد گردش کرتا رہے، اُس کی نزدیک نظام کو بہترین انداز میں چلانے کے لیے یہی طریقہ آزمودہ ہو سکتا ہے۔ ایک خستہ حال ہجوم کو ڈنڈوں سے ہانک کر لے جایا جا رہا ہے، جن کی شناخت کے متعلّق استفسار پر ڈائری والا آدمی، صابر اور شاکر کو بتاتا ہے۔ شہر کی اِس ابتر حالت کا مشاہدہ کرنے کے باوجود شاکر پُر اُمّید ہوتا ہے کہ وہ بالآخر سیما کو ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو جائیں گے، لیکن گرد و پیش کا جائزے لینے کے بعد صابر جان لیتا ہے کہ سیما کی تلاش اب بیکار ہے:

"بڑھتی ہوئی بھیڑ میں اور بدلتے ہوئے سماج میں کسی خاص شخص یا چیز کی تلاش کہاں ممکن ہے۔(13)

جدید عہد، بالخصوص بیسویں صدی میں، سائنسی ترقّیات کے بلند و بانگ دعووں اور سائنس کو دنیا کا نیا مذہب قرار دیے جانے کے باوجود انسان کی کسمپرسی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، بل کہ دنیا میں غربت، افلاس اور بے روزگی کی شرح بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔ اِس صورتِ حال میں سائنس کا کردار انتہائی مخدوش نظر آتا ہے، کہ جب دنیا کی آدھی سے زیادہ آبادی دو وقت کی روٹی سے محروم اور بھوک سے بِلک رہی ہے، تو سائنس انسان کی تباہی کے لیے ایک سے ایک مہلک ہتھیار ایجاد کرنے میں منہمک ہے۔ سائنس کے اِس منفی کردار پر صابر کی بھی نظر ہے۔ سیما کی تلاش میں سرگرداں صابر اور شاکر ایک جلسہ گاہ میں پہنچ جاتے ہیں، جس کا مقرّر بڑے زور و شور سے جدید طرزِ زندگی کی میکانکیت پر گفتگو کر رہا ہوتا

ہے، بعد میں علم ہوتا ہے کہ یہ جلسہ محض بیرونی امداد کے حصول کی خاطر ایک دِکھاوا ہے، جس کے سرپرست سرکاری ملازمین ہیں، اور جلسے کی کارروائی کو اخبار میں چھاپ کر امداد کا حصول یقینی بنایا جاتا ہے۔ اِس قسم کی پابند آزادی کا چلن تیسری دنیا کے ممالک میں آج بھی بآسانی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

ڈائری والا آدمی جس مشینی طرزِ زیست کا قائل تھا، زیادہ دیر نہیں لگتی کہ ویسی ہی پالیسی حکومت بھی اپنا لیتی ہے، اور حکومت کی جانب سے تمام شہریوں کے لیے ایک نیا ضابطۂ اخلاق جاری کیا جاتا ہے، جسے سرکاری گاڑیاں شہر بھر میں بانٹ رہی ہوتی ہیں، یہ ضابطۂ اخلاق censorship کی توضیحی فرہنگ معلوم ہوتا ہے۔ حکومت کی جانب سے شہریوں کے لیے ضابطۂ اخلاق کے اجرا کے چند ہی روز بعد شہر بھر کے تمام 'مین ہول' کھول دِیے جاتے ہیں، اور حرف و صوت و نطق پر عائد کردہ قدغنوں پر مشتمل نیا سرکاری حکم نامہ (حکم نامہ نمبر 84) جاری کیا جاتا ہے، جسے کہ censorship کی انجیل (Bible) کہا جائے تو کچھ بے جا نہ ہو گا:

حکم نامہ نمبر 84

> ہمیں یہ حکم جاری کر کے خوشی ہوتی ہے کہ ہم اپنی زمین پر کسی فتنے اور فساد کو برداشت نہیں کریں گے اور ہر چند کہ یہ فتنہ و فساد الفاظ سے پیدا ہوتا ہے۔ ہم تمام الفاظ استعمال کرنے والوں کو مین ہول میں رہنے کا حکم صادر کرتے ہیں... ہر چند کہ فتنہ اور تخریب کاری کا عمل تصنیف و تالیف و تقریر و تنقید و تنقیص سے پیدا ہوتا ہے جو الفاظ کے جوڑ توڑ اور آرٹسٹک ردّو بدل کی شکلیں ہیں۔ ہم لوگوں کی قوّتِ سماعت اور تابِ ابلاغ کے درمیان امپورٹڈ ماڈولیٹر لگانے کا حکم دیتے ہیں... نیچے والے چند حالات میں اوپر آسکتے ہیں۔ لیکن پرمٹ کی درخواست دینے سے پہلے تین کام ضروری ہیں اور اِن کا تعلّق تین چیزوں سے ہے جن پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ فم، قلم اور قسم۔ پہلے کا بند کرنا۔ دوسرے کا توڑنا اور تیسرے کا نہ توڑنا۔ (14)

چناں چہ یہ 'مین ہول' ہی اب آزادہ روؤں کا مقدّر ٹھہرتے ہیں، جن محض اِس لیے بے تقصیر ہی دھر لیا جاتا ہے کہ وہ آزاد فضا میں سانس لینے کے خواہاں اور اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ فہیم اعظمی نے 'مین ہول' کو جدید طرزِ معاشرت کے حبس زدہ اور متعفّن ماحول کا استعارہ بنا کر پیش کیا ہے، اور اِس ناول کی یہ استعاراتی و علامتی جہت وسیع تر مضمرات کی حامل دِکھائی دیتی ہے، اِس حوالے سے معروف نقّاد ڈاکٹر محمّد علی صدّیقی لکھتے ہیں:

> "ڈِسٹی نیشن مین ہول سماجی و معاشی مسائل کی عکّاسی کرتا ہے۔ اِس ناول کے کلیدی اشارے بہت واضح ہیں۔ "مین ہول" ایک طرح سے یونانی دیومالا کے HADES ہی سے مشابہ ہے۔ کیا "مین ہول" ایک نفسی لازمہ ہے یا تہذیبی مقدّر۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناول کے کردار خود بینی کی سطح سے اوپر اُٹھ کر دور بینی تناظر میں بدل رہے ہیں۔ (15)

صابر بھی ایسے ہی ایک مین ہول میں جا پہنچتا ہے، جہاں ایک نیا المیہ اُس کا منتظر ہوتا ہے کہ وہ اِس تمام گہما گہمی میں شاکر سے جدا ہو جاتا ہے۔ جب وہ شاکر کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اُسے باور کرایا جاتا ہے کہ دراصل صابر اور شاکر دو نہیں ہیں بل کہ ایک ہی وجود ہے، اور صابر جسے شاکر سمجھتا ہے، وہ درحقیقت صابر ہی کا پرتو ہے، یہاں یک جان دو قالب کے بجائے دو جان یک قالب والا معاملہ ہو جاتا ہے:

> "جناب آپ ہی صابر ہیں اور آپ ہی شاکر۔ دونوں الگ الگ نہیں ہو سکتے۔ صبر اور شکر ہزیمت سے سمجھوتے کا نام ہے۔ (16)

صابر اِس بات کو کیسے مان سکتا ہے، وہ کیسے اپنے بیٹے کے وجود سے منکر ہو سکتا ہے، لہٰذا وہ زیرِ زمین دنیا میں شاکر کی تلاش جاری رکھتا ہے۔ وہ ہر اُس آدمی تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، جسے وہ اور شاکر اکٹّھے مِل چکے تھے، مگر اُس کی تمام کوششیں رائیگاں جاتی ہیں۔ اِس دوران میں اُس کی ملاقات سیما کے محلے میں رہنے والے شاعر سے بھی ہوتی ہے:

دیکھیے آپ مجھ سے مِلے تھے۔ اُس کچی آبادی میں جہاں آپ رہا کرتے تھے اور جو بعد میں پکّی ہو گئی اور شاعری بھی وہاں سے چلی گئی۔ وہ شخص صابر کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی بول اُٹھا۔ کیا خوب بات کی آپ نے۔ اب اِسے میری زبانی سنیے:

اب ہائی وے نے شہر کو ویران کر دِیا
پہلے مِری گلی ہی میں رہتی تھی شاعری[17]

فرد اور سماج کے مابین جدید زندگی کے تناظر میں اِسی کش مکش کو فہیم اعظمی نے ڈِسٹی نیشن مین ہول میں انتہائی مؤثر انداز سے پیش کیا ہے۔ ناول کے اختتام پر صابر مین ہول سے فرار ہونے کی کوشش میں لفٹ میں معلّق ہو جاتا ہے، جب کہ شاکر کیرَوَن کے پاس کھڑا ہوتا ہے، اور مین ہول سے باہر کی دنیا میں اُس کے ہم زبان نایاب ہوتے جاتے ہیں۔ فہیم اعظمی کے یہاں نفسِ مضمون کے تدارک کا طریقِ کار اگرچہ صراحت سے عاری ہے، مگر اِس ابہام کے باعث جنم لینے والی ہیجان انگیزی بذاتِ خود خاصی بصیرت افراز واقع ہوتی ہے، بقولِ احمد ہمیش:

"فہیم اعظمی کا قلم بہت سفّاک ہے۔ وہ آدرش واد کی خوش فہمی میں مبتلا نہیں، وہ کسی ڈاگما[Dogma] کے اسیر نہیں، مگر وہ آدمی کو ختم ہوتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتے، وہ محبّت، امن اور آزادی کے مثلّث کو باقی دیکھنا چاہتے ہیں۔"(18)

اِس لحاظ سے دیکھا جائے تو ناول ڈِسٹی نیشن مین ہول فہیم اعظمی کی فکری نہج کی ایک اہم کڑی کا درجہ رکھتا ہے۔ اِس ناول میں اُنھوں نے جدید زندگی کے تناظر میں فرد کے نفسیاتی، جذباتی اور احساساتی ہیجانات کو پیش کرنے کی سعی کی ہے، اور نسلی بُعد کے تصوّر کو بروئے کار لا کر جدید طرزِ معاشرت میں پائے جانے والے داخلی تضادات، اخلاقی دیوالیہ پن اور خطرناک حد تک متجاوز مادّیت پرستی ایسی روزافزوں سماجی تبدیلیوں کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حواشی وحوالہ جات

1. قاضی جاوید، وجودیت (لاہور: فکشن ہاؤس، 2018)، ص 11
2. جمال نقوی، "جدید فکری رویّوں کے امین"، صریر، فہیم اعظمی نمبر (2005)، ص 81
3. پروفیسر عتیق احمد، "دیباچہ"، حصار، فہیم اعظمی (کراچی: الباقریہ پبلی کیشنز، 1987)، ص 12
4. شفیق الرحمٰن، "اُردو ناول میں تکنیک کے تجربات"، (مقالہ برائے پی ایچ ڈی، بہاالدّین زکریّا یونی ورسٹی، 2013)، ص 261-262
5. جیرہارڈ فاک، ارسلا فاک، یوتھ کلچر اینڈ دی جنریشن گیپ (نیویارک: الگورا پبلشنگ، 2005)، ص 53
6. فہیم اعظمی، ڈِسٹی نیشن مین ہول (کراچی: الباقریہ پبلی کیشنز، 1989)، ص 14
7. ایضاً، ص 32
8. ایضاً، ص 51
9. ایضاً، ص 79
10. ایضاً، ص 46

11. ایضاً، ص59

12. ایضاً، ص81

13. ایضاً، ص152

14. ایضاً، ص253-255

15. محمّد علی صدّیقی، ''ڈِسٹی نیشن مین ہول– طلسم خانۂ یقین''، ڈِسٹی نیشن مین ہول، فہیم اعظمی، ص10

16. ڈِسٹی نیشن مین ہول، ص261

17. ایضاً، ص263

18. احمد ہمیش، ''فہیم اعظمی کی ماجرائیت''، پھر کیا ہُوا؟، فہیم اعظمی (کراچی: تشکیل پبلی کیشنز، 1982)، ص190

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

Roman Havashi-o-Havalajat

1. Qazi Javed, *Wajoodiyat* (Lahore: Fiction House, 2018), pg. 11
2. Jamal Naqvi, "Jadeed Fikri Rawaeyoon ke Ameen", *Sareer*, Faheem Azmi Number(2005), pg 81
3. Professor Ateeq Ahmed, "Deebacha", *Hisaar*, Faheem Azmi(Karachi: Al-Baqariyya Publications, 1987), pg 12
4. Shafiq ur Rehman, "Urdu Novel mein Takneek ke Tajrubaat", (PhD Research Thesis, Bahauddin Zakariyya University, 2013), pg 261-262
5. Gerhard Falk, Ursula Falk, *Youth Culture & The Generation Gap* (New York: Algora Publishing, 2005), pg 53
6. Faheem Azmi, *Destination Manhole* (Karachi: Al-Baqariyya Publications, 1989), pg 14
7. Ibid, pg 32
8. Ibid, pg 51
9. Ibid, pg 79
10. Ibid, pg 46
11. Ibid, pg 59
12. Ibid, pg 81
13. Ibid, pg152
14. Ibid, pg 253-255
15. Muhammad Ali Siddiqui, "*Destination Manhole* – Talism Khana-e Yaqeen", *Destination Manhole*, Faheem Azmi, pg 10
16. *Destination Manhole*, pg 261
17. Ibid, pg 263
18. Ahmed Hamesh, "Faheem Azmi ki Majraeyat", *Phir Kya Huwa?*, Faheem Azmi(Karachi: Tashkeel Publications, 1982), pg 190